قاضی عبدالستار سے گفتگو

راشد انور راشدؔ
شعبۂ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ۔202002 (یوپی)

ر۔ا: قاضی صاحب! آپ کے متعلق نقاد حضرات یہ تو فرماتے ہیں کہ قاضی عبدالستار کے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا گیا دیہات، پریم چند کے دیہات سے الگ ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں کرتے کہ یہ فرق کن بنیادوں پر قائم ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو لوگ اپنی تنقیدوں میں دیہات کا ورد کرتے ہیں، انھیں دیہات کے معنی ہی نہیں معلوم ہوں اور جن چیزوں کو وہ دیہات کے بیان سے تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل دیہات کا بیان ہی نہ ہو۔ یہ عین ممکن ہے کیوں کہ اصولی باتیں کرنا اور ان باتوں کا عملی تجربہ ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ جن لوگوں نے دیہات کی زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا ہو، وہ نہ تو تخلیقی فن پاروں میں دیہات کی حقیقی تصویریں پیش کر سکتے ہیں، نہ ہی ان کی تنقیدی تحریروں میں دیہات سے متعلق پیش کیے گئے نکات حقائق پر مبنی ہوں گے۔ اس ضمن میں آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں تا کہ یہ اندازہ ہو کہ علمی تجربہ رکھنے والا تخلیقی فن کار ان باتوں کو کس زاویے سے دیکھتا ہے۔

ق۔ع: میں طالب علمی کے زمانے میں جب ترقی پسندوں کے اردو ناول پڑھتا تھا تو خیال آتا تھا کہ یہ لوگ یا جھوٹ بول رہے ہیں، یا انھیں ہمارے دیہات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ ابھی تک پریم چند اور ان کے ہم عصروں کے دیہات میں زندہ ہیں۔ یہ لوگ ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنے تخیل کے گاؤں کے باشندوں کو زمینداروں اور کسانوں میں تقسیم کر کے سیلولائڈ کے گاؤں بنا رہے ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ میں نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' کے نام سے لکھا جو ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ جب وہ ناول شائع ہوا تو ''قومی آواز'' کے ادبی ایڈیشن میں ایک ترقی پسند مولوی رضا انصاری فرنگی محل نے تبصرہ کیا کہ یہ Reactionary ہے اور میلوڈرامہ ہے۔ ایک بات اور بتاؤں آپ کو۔ میں نے آج تک اپنی کوئی کتاب کسی نقاد، کسی استاد کی خدمت میں نہیں پیش کی۔ نہ صرف یہ بلکہ میں نے اپنی کوئی کتاب کسی میگزین کو تبصرے کے لیے نہیں بھیجی، نہ کسی انعامی کمیٹی کے لیے بھیجی۔ کیا آپ ایسی کوئی دوسری مثال اردو ادب میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں تو بات تبصرے کی چل رہی تھی۔ اس تبصرے کا ردِعمل مجھ پر بہت شدید ہوا اور میں نے طے کیا کہ میں اور لکھوں گا اور اسی نقطۂ نظر سے لکھوں گا۔ چنانچہ میں نے 'شب گزیدہ'، 'غبارِ شب'، 'مجو بھیا' اور 'بادل' تا بڑتوڑ لکھے۔ اگر میرا پہلا ناول یعنی ''شکست کی آواز'' Reactionary ہے تو یہ سب Reactionary ہے۔ زمین دار جس کی حالت قابلِ رحم ہے، وہ گاؤں کی عدالت، پنچایت کے سامنے جیسے کٹہرے میں کھڑا ہوا ملزم ہے اور اس کے مقدمات کا فیصلہ آج وہ آدمی کر رہا ہے جو اس کے سامنے کبھی بیٹھنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اس Torcher کو میں نے افسانوں اور ناولوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔

ر۔ا: آپ کا پہلا ناول ہی کافی ہنگامہ خیز رہا۔ زبان و بیان اور اسلوب کی سطح پر اس میں بھی وہ خوبی موجود تھی جو بعد میں آپ کا اختصاص قرار پائی اور شاید اسی بنا پر مسعود حسن رضوی ادیب نے اسے آپ کی تخلیق ماننے سے انکار کر دیا تھا، لیکن پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی Recommendation پر نہ صرف وہ ناول اہتمام سے شائع ہوا بلکہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پہلے ناول پر کچھ تلخ تبصرے بھی ہوئے، لیکن اس پر کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے آپ نے اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ بہت اہم بات ہے، ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ اوّلین تخلیق اگر مخالفین کی زد میں آجائے اور اعتراضات کا سلسلہ پروان چڑھنے لگے تو مصنف کے تمام تر حوصلے جواب دینے لگتے ہیں اور وہ اپنا تخلیقی سفر ترک کر کے، احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر گوشۂ گم نامی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور آپ نے اپنا ردِعمل، مستقل تحریروں کے ذریعے کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ بات ناولوں کی چل نکلی ہے تو میں چاہوں گا کہ یکے بعد دیگرے تمام ناولوں پر بحیثیت تخلیق کار آپ کا نقطۂ نظر سامنے آئے۔ اس سے یہ نظریہ بھی سامنے آئے گا کہ ایک نقاد کتنی چیزوں سے صَرفِ نظر کرتا ہے اور تخلیق کار کن پہلوؤں کو اپنی بنیادی ترجیحات میں شامل رکھتا ہے۔

ق۔ع: ''شب گزیدہ'' میرا دوسرا ناول ہے، یہ خالص معاشرتی ناول ہے۔ پہلے ناول میں پوری بات، پورا دیہات اور دیہات کے وہ بڑے

بڑے کردار جو میں نے دیکھے تھے، یا جنھیں میں جانتا تھا، وہ نہیں آ سکے تھے۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے کوشش کی ہے کہ وہ تمام باتیں آ جائیں جو بحیثیت تخلیق کار مجھے اندر سے بے چین کر رہی تھیں۔ اس ناول میں میں نے زمین دارانہ نظام کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے۔ دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمین دار ہے۔ وہ اپنی زمین داری پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اپنے بیٹے، باپ، بھائی کسی کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔ اگر اس کو کسی کا ہاتھی یا گھوڑا پسند آ گیا تو اس کے حصول کے لیے گھروں کو اُجاڑ سکتا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے مذہب کو بھی تبدیل کر سکتا ہے، لیکن اپنے ہاتھ سے زمام اقتدار کو نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے قدیم تصورات کے حامل زمین دار اور نئی قدروں کے حامل اس کے اکلوتے بیٹے کے ٹکراؤ کی کہانی پیش کی ہے۔ جو کچھ بھی میں نے ناول میں پیش کیا ہے وہ حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ میرے جوار کے ایک رئیس نے اپنے بیٹے کو اپنی حکومت کے نام پر قتل کر دیا۔ اس ہولناک واقعے پر میں نے ''شب گزیدہ'' لکھا۔ اس ناول میں پہلی بار کسی تعلقہ دار کے گھر کی پوری روداد بیان کی گئی ہے۔ داشتاؤں، رکھیلوں کا بیان ہے، بیوی کی مجبوری اور بیٹے کی معذوری اور ملازموں کی خود اختیاری تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قصباتی زندگی میں مولوی، پہلوان، ساہوکار، بدمعاش، گروہ بند اور وفادار کرداروں کو پیش کیا گیا ہے، اور مجھے یاد پڑتا ہے شاید یہ ناول بھی ''نقوش'' نے پہلی سطر سے آخری سطر تک پورا چھاپ دیا۔ اسی ناول کے ترجمے نے بابا ناگارجن کو مزید تقویت دی جو ''پہلا اور آخری خط'' کے ذریعے پیدا ہوئی تھی اور انھوں نے مجھے ''تام پتر'' دیا۔ ناول میں میں نے دکھایا ہے کہ زمیندار کا نوجوان بیٹا، جب زمین دار پر غالب آنے لگتا ہے تو وہ اس کو زہر دے دیتا ہے۔ پورا ناول اودھ کے زمینداروں کی اقدار، ان کی اچھی بری پہچان، ان کی گھریلو زندگی کے بکھان پر مبنی ہے۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے حضرات جنھوں نے میرا سرسری مطالعہ کیا ہے یا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، وہ مجھ کو زمین دارانہ نظام کا حامی تصور کرتے ہیں، لیکن اگر وہ مجھے غور سے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ میرے عہد میں کسی نے بھی زمینداروں کے مظالم کا مجھ سے سخت بیان نہیں کیا ہے۔ خیر یہ تو میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے پڑھنے والے پوری طرح اس سے اتفاق نہ کریں، لیکن میرا یہ بیان ان کے مطالعے کی نشان دہی تو کر ہی سکتا ہے۔

ر۔ا: قاضی صاحب! ایک ہی متن کو پڑھنے کے زاویے مختلف ہو سکتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم کسی متن کو پڑھ کر جو تاثرات قبول کر رہے ہیں، بالکل وہی تاثرات دوسروں کے بھی ہوں۔ یہ تو ضرور ہوتا ہے اور ایک اچھے متن کی یہ خوبی بھی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو مختلف جہتوں پر غور کرنے کے لیے مجبور کرے۔ ہر قاری کی اپنی ایک ذہنی سطح ہوتی ہے، تربیت کا مختلف پس منظر کارفرما ہوتا ہے، غور وفکر کی صلاحیتیں جداگانہ ہوتی ہیں اور اسی بنا پر متن سے متعلق ردِعمل کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ قارئین کے مقابلے میں تخلیق کار کا زاویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک نقاد اور قاری، فن پاروں کے حوالے جن نکات کو اُجاگر کرتا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس متن کا خالق، اس متن سے متعلق کیا کچھ سوچتا ہے اور اس کے غور وفکر کی مختلف جہات کیا ہیں، یہ باتیں بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ متن کی تخلیق کے بعد ہر چند کہ مصنف کا اس متن سے رشتہ باقی نہیں رہ جاتا اور نئے تنقیدی تصورات نے اس نوع کے نظریات کو کافی فروغ بھی دیا ہے، لیکن کسی تخلیق کے ساتھ تخلیق کار کا جو رشتہ ہوتا ہے، اس رشتے کی مناسبت سے وہ جن پہلوؤں کا بیان کرے گا، اس کی بنیادی اہمیت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آپ کے خیالات سے ممکن ہے نقاد حضرات اختلاف فرمائیں، لیکن آپ کے خیالات سے ان کے مطالعے کی نشان دہی ضرور ہوگی اور اسی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ اپنے تمام ناولوں پر آپ اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار فرمائیں۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے خیالات سے کتنے لوگ اتفاق کریں گے۔ مجھے نقاد حضرات کے خیالات سے نہیں، ایک تخلیق کار کے براہِ راست وضاحت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے مشہور ناول ''داراشکوہ'' کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اس ناول کی تفہیم میں مزید معاون ہو سکیں۔

ق۔ع: ''داراشکوہ'' کے بارے میں مشہور ہوا کہ پاکستان میں اس کی جلدیں جلائی گئیں اور کراچی پریس کلب میں جلائی گئیں۔ جب میں کراچی گیا اور مجھے کراچی پریس کلب نے مدعو کیا تو مجھے ڈر تھا کہ دیکھیے کیا سلوک ہوتا ہے، لیکن ڈیڑھ دو سو کا مجمع تھا۔ میرا خیال ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور تقریر کی فرمائش کی۔ تقریباً ہر مؤرخ نے اورنگ زیب کی مذہبی حیثیت کی پیش کش میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے اور اس کی عظمت کے بیان میں چار چاند لگا دیے۔ میں نے جب پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اورنگ زیب غاصب تھا۔ اس لیے کہ سامو گڑھ کی لڑائی داراشکوہ سے تھی، شاہ جہاں سے نہیں تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ داراشکوہ کو شکست دے کر آگرے آتا اور اپنے

باپ کے قدموں پر سر جھکا دیتا، لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر قلعے پر قبضہ کرلیا، باپ کو نظر بند کردیا، پانی بند کردیا تاکہ قلعے کے ملازمین کی اکثریت قلعہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ حکم دیا گیا کہ قلعے سے جو جانا چاہتا ہے، وہ جائے، لیکن کوئی شخص قلعے کے اندر نہیں جاسکتا۔

پوری مغل تہذیب میں داراشکوہ سے زیادہ سیکولر مزاج کا عالم و فاضل کوئی شخص نہیں تھا۔ اس کے یہاں اکبر کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کے ساتھ ساتھ علم و فضل کی جو شان ملتی ہے، وہ مغلوں کے کسی کردار کو میسر نہیں آئی۔ اورنگ زیب کا سارا علم Sectarian تھا۔ وسعت قلب اور سرچشمی کے الفاظ سے وہ شخص ناواقف تھا۔ داراشکوہ کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی پوری زندگی میں کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کنیزیں اس کی خلوت کا زیور بنی ہوں۔ قندھار کے محاصرے میں اس نے جس وسیع النظری کا ثبوت دیا، وہ اپنی مثال آپ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام مغل شہنشاہوں کی طرح اور بڑے کرداروں کی طرح داراشکوہ پر نجومیوں وغیرہ کا بھی اثر تھا۔ مثلاً وہ شگن لیتا تھا۔ شگن مولوی صاحب (اورنگ زیب) بھی لیتے تھے۔ ثبوت بھی موجود ہے۔ مہاراجہ جودھ پور جو کہ داراشکوہ کے حکم پر اورنگ زیب کا راستہ روکنے چلا تھا، اُجّین کے قریب دونوں کے لشکر کھڑے ہوئے۔ اورنگ زیب کی سیاست یہ تھی کہ مہاراجہ کو پوری طرح تباہ کردیا جائے، لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ لڑائی کا سارا الزام راجہ پر آئے۔ مہاراجہ نے صلح کی جو شرائط پیش کیں، ان پر گفتگو کے لیے اورنگ زیب نے ایک سہ ہزاری منصب دار بھیجا۔ مہاراجہ اکڑ گیا کہ میں ہفت ہزاری میں سہ ہزاری منصب دار سے کیا بات کروں اور لڑنے پر تیار ہوگیا۔ اورنگ زیب تو لڑنے کو تیار تھا ہی۔ ایک روز اس کا کوئی جنگی ہاتھی بگڑ گیا۔ اورنگ زیب اپنے کیمپ سے باہر نکلا اور اس نے اپنے ہاتھی کو ڈانٹا۔ ہاتھی ڈانٹ سنتے ہی بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب نے فوراً حملے کا حکم دیا کہ اس وقت میرا ستارہ عروج پر ہے، فوراً حملہ کرو اور حملہ ہوا اور مہاراج کو شکست ہوئی۔ اس فتح نے داراشکوہ پر نفسیاتی دباؤ ڈالا اور پہلی بار داراشکوہ کو اورنگ زیب سے خوف محسوس ہونے لگا۔

داراشکوہ کو اس کے مشیروں اور مولویوں نے سمجھا رکھا تھا کہ جناتوں کا لشکر آئے گا اور قندھار کو فتح کرلے گا۔ بھولا بھالا شہزادہ، ہم جلیسوں کے اس بیان سے مطمئن تھا اور یقین کیے بیٹھا تھا کہ جناتوں کا لشکر قندھار کو فتح کرکے اس کی خدمت میں پیش کردے گا۔ کردار کی اس کمزوری نے داراشکوہ کو ایک بڑی ناکامی سے ہم کنار کیا۔ میدانِ جنگ میں بھی داراشکوہ کا جو انداز شامل تھا، وہ عالموں کا تھا، سپاہیوں کا نہیں تھا۔ مثلاً جب وہ ساموگڑھ کے میدان میں عالم پسند نامی ہاتھی پر سوار ہونے کے لیے بڑھا تو کہا غریب معاف، مغرور مرگ اس قول کے مقابلے میں اورنگ زیب کا قول ملاحظہ کیجیے، جو ہاتھی پر سوار ہوتے ہوئے نعرہ لگاتا ہے: ''آج اپنا سر نہیں، یا دشمن نہیں۔'' اس نعرے میں جو ہیبت ہے وہ داراشکوہ کے قول میں کہاں ہے۔ شکست کے بعد داراشکوہ فرار تھا۔ اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی بیوی کو کہیں قلعے میں رکھ دے، لیکن بیوی نے یہ منظور نہیں کیا۔ داراشکوہ کو اس فرار میں بیوی کی وجہ سے بہت سی زحمتیں اُٹھانی پڑیں، لیکن اس نے اس کو چھوڑنا منظور نہیں کیا۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ اگر وہ اپنی بیگم کو کہیں چھوڑ دیتا تو ایران پہنچنے میں اس کو آسانی ہوتی، لیکن داراشکوہ کی محبت نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

ر۔ا: قاضی صاحب! صرف اسی بنا پر میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ بحیثیت تخلیق کار آپ اپنے خیالات اور تاثرات سے آگاہ فرمائیں۔ کیوں کہ تخلیق کار کے محسوسات، نقاد کے نظریات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں اور جو باتیں سامنے آتی ہیں، وہ تنقیدی محاسبے میں کسی طرح نہیں آپاتیں۔ داراشکوہ کے حوالے سے ابھی آپ نے جتنی باتیں بھی بیان کیں، وہ مغل تہذیب کے اس قدرے مختلف شہزادے کی تفہیم میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس انداز سے ناول ''داراشکوہ'' میں نہیں آئی ہیں، لیکن آپ کے بیان سے جن نکات کی وضاحت ہوئی ہے، انھیں پیش نگاہ رکھیں تو ہمیں داراشکوہ کے کردار کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تخلیق کار کے خیالات سے متن کے مرکزی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے پس منظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کس تناظر میں تخلیق کار نے مخصوص متن کو خلق کیا ہے۔ ''داراشکوہ'' کی طرح آپ کے ناول صلاح الدین ایوبی نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ ہندوستانی تاریخ سے متعلق فکشن کا ایک بے مثل نمونہ پیش کرنے کے بعد آپ اسلامی تاریخ کی جانب کیسے راغب ہوگئے، کیوں کہ صلاح الدین ایوبی کے بعد آپ نے خالد بن ولید کی تخلیق بھی کی جو اسلامی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے۔ پہلے آپ صلاح الدین ایوبی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

ق۔ع: جب میری والدہ نے میرا ''بادل'' ناولٹ پڑھا تو انھوں نے برجستہ فرمایا کہ جب تم ہاتھی پر لکھ سکتے ہو تو تمھیں صلاح الدین ایوبی پر ضرور لکھنا چاہیے۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ لکھوں گا اور میں نے پڑھنا شروع کردیا۔ شعبے میں میری تدریس کی بھی شہرت تھی۔ اس شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے پڑھنا پڑتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ

میرے شاگرد پورے وقت دم بخود بیٹھے رہیں۔اس لیے مواد کی خاطر پڑھنے کو بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی صلاح الدین ایوبی کے بارے میں جو کچھ بھی میسر آیا وہ سب میں نے پڑھ ڈالا۔اس کردار نے مجھے اس لیے متاثر کیا کہ یہ پہلا فاتح ہے جس نے مفتوحہ شہروں کو مکمل امان دی اور ایک ایک فرد کی حفاظت کی۔ حالاں کہ اس زمانے کا رواج تھا کہ عیسائی فاتح جس شہر کو فتح کرتے، اسے خاک وخون میں نہلا دیتے۔ایک بات جو سلطان کی مجھے بہت پسند آئی کہ اس نے مفتوح رعایا پر کبھی ظلم نہیں کیا۔اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ ایک ملک کی عیسائی رعایا پر دوسرے ملک کے عیسائی حاکم نے جو مظالم کیے تھے، اس کو سزا دینے کے لیے پوری ایک لڑائی لڑی گئی۔ یہ خیال اس لیے بھی آتا تھا کہ سلطان کی رعایا میں تو عیسائی اور یہودی تھے، مگر ان کی قتل و غارت گری کا کوئی واقعہ پڑھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے فسادات نے بھی سلطان کی اس خوبی کو بہت زیادہ روشنی دی اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ پروفیسر آل احمد سرور جو ''ہماری زبان'' کے ایڈیٹر بھی تھے، فرمایا کہ جب ''صلاح الدین ایوبی'' مکمل ہو جائے تو مجھ کو دینا کہ میں ہماری زبان کے تخلیقی نمبر میں پورا ناول شائع کر دوں گا۔ میں نے مکمل کرنے کے بعد ناول ان کی خدمت میں پیش کیا۔انھوں نے پڑھا اور معذرت کر لی۔اسی زمانے میں سلیمان اریب آئے ہوئے تھے۔ان کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ یہ ناول میں ان کو دے دوں۔ وہ رسالہ ''صبا'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ''صبا'' کے پورے ایک شمارے میں وہ ناول شائع کر دیا جائے گا۔ اس کی اشاعت میں اقبال متین کا دخل تھا۔ جب یہ شائع ہوا تو اس کے تعارف میں یہ لکھا گیا کہ یہ دلچسپ ناول ہے۔تھوڑے دنوں بعد غلام ربانی تاباں علی گڑھ تشریف لائے اور مجھے حکم دیا کہ میں وہ شمارہ ان کی خدمت میں پیش کروں اور اشاعت کے پہلے اجازت نامہ لکھ دوں۔ تاباں صاحب نے وہ ناول مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع کیا جس کے وہ کنوینر تھے اور مجھے بارہ سو روپے دیے۔ یہ دلچسپ ناول حیدرآباد کی ایک سیاسی جماعت کے سربراہ کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے مجھے سرکار دوعالم کا جودن منایا جاتا تھا حیدرآباد میں، اس کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ وہ خط میں نے اپنی والدہ کو دے دیا۔انھوں نے پڑھتے ہی حکم دیا کہ تم اس قابل نہیں ہو جو اتنے بڑے منصب پر فائز کیے جاؤ۔ فوراً معذرت نامہ لکھو اور میں نے معذرت نامہ لکھ دیا۔اس ناول پر مجھے پہلا ''غالب ایوارڈ'' ۱۹۷۳ء میں ملا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔

میں نے صلاح الدین ایوبی کے بارے میں جتنے ناول پڑھے، ان میں ایلی نور ملکۂ فرانس کے عشق کا بیان ملا۔یعنی ملکہ سلطان پر عاشق تھی اور شراب کا بھی ذکر ملا۔ میں نے ملکہ کے تعلقِ خاطر کا ذکر کیا ہے، جسمانی قربت کا بھی ذکر کیا ہے اور ملکہ کی بادہ نوشی کا بھی ذکر کیا ہے۔خفیف سا ذکر ہے۔آخری زمانے میں سلطان سے ایک جنرل ''الہکاری'' نے جوان سے بے تکلف تھا، سوال کیا کہ آپ نے کبھی شراب پی۔سلطان خاموش رہے، سلطان نے انکار نہیں کیا۔ انکار نہ کرنا ایک خوب صورت اقرار ہے۔ یہ ہمت کسی میں نہیں تھی کہ وہ ایلی نور کے بارے میں سوال کرتا، اس لیے اس کا ذکر نہیں آیا۔ جب ملک العادل جو نائب سلطنت تھے، انھوں نے جب یورپ پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی تو صرف اس وقت سلطان کی اجازت کا مسئلہ درپیش تھا۔سلطان کے آخری زمانے میں جب وہ بیمار تھے تو ملکہ ایلی نور نے اپنے بیٹے رچرڈ کی رہائی کے لیے جس کو اس کے چھوٹے بھائی ''جان'' نے گرفتار کر لیا تھا، سلطان کے پاس سفیر بھیجا تھا اور سلطان ایک عجیب وغریب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بالآخر اس نے یورپ نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسی کش مکش کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی اس کا کلائمکس ہے۔سلطان کا قول تھا کہ ہم نے ہمیشہ دین کی حفاظت کے لیے تلوار نکالی ہے۔شوقِ جہاں بانی کو یہ شرف عطا نہیں کیا گیا اور یورپ پر حملہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک اشتہار دیا تھا کہ دنیا میں کوئی شخص اگر سلطان کی تلوار دے سکے، یا اس کا پتہ بتا سکے تو ہم اسے دس لاکھ ڈالر دیں گے۔ میں نے یہ ذکر جب پڑھا تو میں سوچتا رہا کہ میں سلطان کی تلوار کا کیا کروں اور میرا یہ دعویٰ بھی تھا کہ میرا ناول تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ تلوار کو دفن کر دینا چاہیے اور میں نے تلوار کو دفن کر دیا۔

ر۔ا: اس سے بہتر صورت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی آپ نے تخلیقی ذہانت کا عمدہ ثبوت پیش کیا۔اسی رویے کی بنا پر تاریخی ناول کا دعویٰ بھی برقرار رہا اور ناول میں درآئے ایک اہم مسئلے سے نجات بھی مل گئی۔ تاریخی حقائق کی پیش کش اور اس کی اہمیت سے کسی بھی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، لیکن تخلیقی فن کار اگر اپنے فن پاروں میں تخلیقی ذہانتوں کے نمونے پیش کرتا ہے تو مختلف سطحوں پر اسے سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔''صلاح الدین ایوبی'' کی اشاعت کا معاملہ بھی نشیب وفراز سے دوچار رہا، لیکن جب وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تو اسے غالب ایوارڈ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور وہ بھی پہلا ''غالب ایوارڈ'' آپ کے حصے میں آیا۔ظاہر ہے اس اعزاز سے آپ کو زبردست تحریک ملی ہوگی اور

ایک بار پھر آپ نے اسلامی تاریخ کے ایک اہم کردار خالد بن ولید کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ خالد بن ولید کی تاریخی شخصیت ہر لحاظ سے متاثر کن رہی ہے۔ اس کردار کے کن پہلوؤں نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ ناول لکھنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

ق۔ع: اماں نے جب میرا ناول صلاح الدین ایوبی پڑھا تو اپنی خوشی کا اظہار تو مجھ سے نہیں کیا، لیکن بہت خوش ہوئیں، اور مجھ سے فرمایا کہ اب تم خالد بن ولید پر لکھو۔ میں نے پڑھنا شروع کیا، لیکن صحرا میری گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ خواہش تھی کہ میں عرب کا صحرا دیکھ سکتا اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا سفیر ہندوستان سے کہ ہم قاضی صاحب کو عرب بھیج سکتے ہیں، لیکن ہمارے سفیر نے فرمایا کہ وہ خود ہم کو عرب بھیج دیں گے، لیکن وہ بات آئی گئی ہوگئی۔ تاہم ایک بار میں راجستھان گیا اور جیسلمیر سے تیس چالیس کلومیٹر کا سفر صحرا میں کیا اور کچھ اندازہ ہوگیا۔ جب تاریخ پڑھ رہا تھا تو یہ احساس ہوا کہ حضرت عمر نے خالد بن ولید کو معزول کر کے جلال کا اظہار کیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے خیال ہوتا تھا کہ حضرت عمر فاروق اعظم، امیر المومنین کے ساتھ ساتھ آمر المومنین بھی تھے، مگر ان کی عظمت کا لحاظ کر کے میں نے یہ بات واشگاف الفاظ میں نہیں لکھی۔ سیف اللہ کے کردار کی اسلامی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ سیف اللہ نے سولڑائیاں لڑیں اور ہر جنگ میں فتح پائی۔ تاریخ عالم کا ایسا کوئی دوسرا جنرل پیدا نہیں ہوا۔ اتنا بڑا جنرل، اتنا بڑا سپاہی محض ملت کے نظم ونسق کے لیے اپنی توہین گوارہ کرلے، اس کی بھی نظیر نہیں ہے۔ جتنی کتابیں میں نے پڑھیں ان کے بین السطور میں یہ بات موجود تھی کہ اگر سیف اللہ نے حضرت عمرؓ کے خلاف تلوار کھینچ لی ہوتی تو عرب میں قیامتِ صغریٰ برپا ہوجاتی، لیکن یہ سب سیف اللہ کے کردار کی عظمت تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ فرماں روائے ایران اور قیصر روم دونوں اس انتظار میں مبتلا تھے کہ سیف اللہ کی بغاوت کی خبر آئے اور وہ جشن منائیں لیکن ان کو یہاں بھی ناکامی ہوئی۔ حضرت علیؓ کا جو بیان ہے وہ لفظ لفظ تاریخ میں موجود ہے اور انہی کے بیان نے شاید حضرت عمرؓ کو خالدؓ کے خلاف کسی اقدام سے باز رکھا اور معزولی پر اکتفا کی۔

قبیلہ بنو تمیم کی ایک دوشیزہ کو حضرت خالدؓ نے عکاظ کے میلے میں دیکھا اور شاید متاثر ہوگئے، لیکن اس کی شادی مالک بن نویرہ سے ہوگئی۔ سرکارِ دوعالم کے وصال کے بعد ارتداد کی جو آندھی چلی اس کو ختم کرنے کے لیے نائب رسول اللہ نے حضرت خالدؓ کو نام زد کیا۔ حضرت خالدؓ فتوحات کا پرچم لہراتے ہوئے مالک بن نویرا کے قبیلے تک پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ مالک بن نویرہ بھی مرتد ہوگیا ہے۔ سیف اللہ نے حملہ کیا اور مالک بن نویرا گرفتار ہوگیا۔ حضرت خالدؓ نے اسے قید کردیا۔ اس خیال سے کہ اس کو صبح دربار خلافت کے لیے روانہ کردیا جائے گا، لیکن ان کے کچھ جوشیلے نائبین نے مثلاً حضرت ضرّار نے زبان کی ذرا سی تفہیم کی لغزش کی بنا پر مالک بن نویرا کو قتل کردیا۔ ان کی بیوہ کا جب سامنا ہوا تو سیف اللہ نے کہا کہ تم میرے آباد گھر کو مزید آباد کرسکتی ہو۔ وہ تیار ہوگئیں۔ سیف اللہ نے عدت کے پورے دن گزار کر ان سے نکاح کرلیا۔ مالک بن نویرا کا ایک بھائی بہت اچھا شاعر تھا۔ اس نے مالک بن نویرہ کی موت پر ایسا زبردست مرثیہ لکھا کہ حضرت عمرؓ اس کو سن کر بے قرار ہوگئے اور حضرت ابوبکرؓ سے اصرار کیا کہ خالدؓ کو معزول کردیا جائے۔ خلیفہ اکبر نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ خدا نے نبیؐ کی اُمت کی حفاظت کے لیے جو تلوار علم کی ہے، اسے نیام کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ تاہم سیف اللہ کو دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم بھیج دیا۔ سیف اللہ نے اپنی جو صفائی پیش کی وہ نائب رسول اللہ نے قبول فرمائی، لیکن شاید حضرت عمرؓ نے منظور نہیں کی اور جب وہ نائب رسول اللہ ہوئے تو جو پہلا حکم نامہ لکھا وہ خالدؓ کی معزولی کا لکھا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعید الظفر چغتائی نے خالدؓ بن ولید پر جو مضمون لکھا، اس میں ان سے سہو ہوا اور انھوں نے ہندہ کو سیف اللہ کے تعلق خاطر کا مرکز بنادیا۔ اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے اتنی احتیاط سے ان چیزوں کا بیان کیا ہے کہ اگر آدمی بہت غور سے نہ پڑھے تو سہو ہونے کا امکان ہے۔ ابوسفیان نے خاص کوشش کی کہ سیف اللہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجائیں اور بنوامیہ بھی ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے خلاف تلوار چلائے، لیکن سیف اللہ کی استقامت کے آگے کوئی کامیاب نہیں ہوسکا۔

سید والا تبار کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں خالدؓ بن ولید پر ناول لکھ رہا ہوں تو انھوں نے طلب فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہر چند ''تہذیب الاخلاق'' میں اس کی بالاقساط اشاعت سے آپ کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن میری خواہش ہے کہ آپ پورا ناول اس میں شائع ہونے دیں۔ چنانچہ اس کی قسطیں ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے لگیں۔

ر۔ا: آپ نے ثابت کردیا کہ نہ صرف تاریخ سے آپ کو غیر معمولی دلچسپی ہے بلکہ اسلامی تاریخ کے رموز ونکات سے بھی آپ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ مذہب کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ کوئی بھی بات کہنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کرلینا ضروری ہوتا ہے اور بعض معاملات میں تو تحقیق شدہ باتوں کو بھی نزاکت کے پیش نظر بیان کرنے میں

خاصی دقت پیش آتی ہے۔ آپ ان تمام مرحلوں سے گزرے اور کامیابی کے ساتھ گزرے۔ آپ نے اس بات سے بھی واقف کرایا کہ اسلامی تاریخ کے دو عظیم کرداروں سے متعلق دونوں ناول آپ نے والدہ محترمہ کی تحریک پر خلق کیے۔ آپ کو ادبی ماحول وراثت میں نہیں ملا، نہ ہی گھر میں ادب کا کوئی ماحول تھا، لیکن والدہ محترمہ سے آپ کو خاصی عقیدت تھی اور ان کی شخصیت کا رعب شروع سے ہی آپ کے وجود پر غالب رہا۔ اگر گھر میں ادبی ماحول پہلے سے موجود نہ ہو، لیکن گھر کا کوئی اہم فرد، فن کار کے تخلیقی مرحلوں میں دلچسپی لے، اس کی تخلیقات کو دلچسپی سے پڑھے اور بعض موقعوں پر اہم مشورے بھی دے تو غضب کی تحریک ملتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے آپ کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور آپ نے صلاح الدین ایوبی اور خالدؓ بن ولید کی شکل میں دو اہم ناول تخلیق کیے۔ ناول اور تاریخی ناول کے ذیل میں بہت سی باتیں ذہن میں آرہی ہیں، لیکن سرِ دست میں آپ کے ناولوں سے متعلق گفتگو کو مکمل کرنا چاہتا ہوں تاکہ ایک تسلسل قائم رہے۔ دوسری تمام باتیں لازمی طور پر اس کے بعد گفتگو کا حصہ بنیں گی۔ آپ نے ادبی تاریخ کے ایک اہم کردار غالب کو بھی ناول کے لیے منتخب کیا اور ایک کامیاب ناول لکھا۔ اپنے ناول ''غالب'' کے حوالے سے کچھ ایسی باتوں کا بیان کیجیے جو نہ صرف پس منظر کو سمجھنے میں معاون ہو، بلکہ ناول کی تفہیم کا بنیادی سرا بھی ہاتھ آسکے۔

ق۔ع: ''غالب'' ناول تو میں نے فرمائش پر لکھا۔ ہوا یہ کہ جب فخر الدین علی احمد نے جو غالب انعام کمیٹی کے وائس چیئرمین تھے، مجھے غالب ایوارڈ دیا تو یہ فرمایا تھا کہ آپ غالب پر ناول لکھیے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ بنگلہ کے ایک ادیب سے جو پدم بھوشن بھی تھے، وزیر موصوف نے فرمائش کی تھی اور وہ غالب کی دلّی کی Topography کے لیے دلّی میں قیام پذیر بھی ہوئے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے معذرت کرلی تھی۔ طالب علمی کے زمانے سے میرا خیال تھا کہ غالب جیسا مغرور اور مغل تہذیب کا زرّیں نمائندہ ایک ڈومنی پر کیسے عاشق ہوسکتا ہے۔ وہ اس کے شہوانی تعلق میں تو مبتلا ہوسکتا ہے، لیکن اسے محبوبہ کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اپنی منھ بولی بہن بیگم حمیدہ سلطان کی زبانِ مبارک سے جب میں نے یہ سنا تھا کہ غالب کسی ایرانی رسالدار کی بیوہ کی اصلاح فرماتے تھے اور اچانک اس کا انتقال بھی ہوگیا تو مجھے غالب کی محبوبہ مل گئی۔ میں نے اس عہد کے سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود صاحب سے اس ایرانی بیوہ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں بیگم حمیدہ سلطان کے بیان پر یقین نہیں کرتا، لیکن آپ کو ناول لکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں، اس لیے کہ آپ غالب کی سوانح عمری نہیں لکھ رہے ہیں، غالب پر ناول لکھ رہے ہیں اور غالب کے معاشقے کے لیے ایرانی رسالدار کی بیوہ یقیناً بہت مناسب کردار ہے۔ میں نے جب منٹو کی لکھی ہوئی فلم غالب دیکھی تو مجھے افسوس بھی ہوا تھا، اور اس کی وہ غزل- ''شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں + ختم تھی اس پر وفا کی پردہ داری ہائے ہائے'' جب پڑھتا تھا تو جیسے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شعر ڈومنی کے لیے کہا گیا ہے۔ ابھی میں اس کش مکش میں مبتلا تھا کہ غالب کا ایک اور شعر مل گیا- ''ہاں غالبِ خلوت نشیں بمِ چناں عیشِ چنیں + جاسوسِ سلطاں در کمیں معشوقِ سلطاں در بغل'' اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ڈومنی غالب کی معشوقہ تھی تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ وہی ڈومنی سلطان کے بغل میں تھی۔ رہا یہ اعتراض کہ شعر ہمیشہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس شعر کا کیا جواز ہے..... ''شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے۔'' ہمارے پاس شاعروں کے اشعار کے علاوہ ثبوت نام کی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر زمانے میں خطوط بازی ہوئی ہو اور اگر خطوط بازی ہوئی بھی تو اس کا ملنا ناممکن ہے۔ اس لیے میں نے غالب کی ہیروئن ترک بیگم کو مان لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ نواب شمس الدین کی پھانسی کا واقعہ بھی میں نے بیان کیا ہے، جس نے غالب کی زندگی کو عذاب میں مبتلا کردیا تھا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ غالب نے نواب شمس الدین کی مخبری کی ہے۔ نواب شمس الدین اس قدر بے وقوف تھا کہ بھرے دسترخوان پر انگریز ریزیڈنٹ کی موت کا ذکر کرتا ہے۔ ایک شخص اور وہ بھاگ کر انگریز کی حدود میں داخل ہوکر پوری رام کہانی سناتا ہے تو پھر غالب پر شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ میں نے نواب شمس الدین کا واقعہ پڑھا تو معلوم نہیں کیوں مجھے اس وقت بھی یقین تھا اور آج بھی ہے کہ نواب شمس الدین نے ریزیڈنٹ کو قتل کرنے کا جو فیصلہ کیا، وہ کسی بہت بڑے سبب کا نتیجہ تھا۔ مثلاً نواب شمس الدین کے والد نواب فیروز پور جھرکا اور ریزیڈنٹ میں خاصی دوستی تھی۔ اس کا امکان ہے کہ انگریز ریزیڈنٹ نے نواب کی کسی بیگم کو دیکھ لیا ہو اور عشق میں مبتلا ہوگیا ہو اور نواب شمس الدین کی غیرت نے اس کے قتل کا منصوبہ بنا لیا ہو۔ میں ان باتوں کو ناول میں اس لیے بیان نہیں کرپایا کہ اس کے لیے Archieves تک کی رسائی حاصل کرنا پڑے گی جس کی نہ فرصت تھی، نہ دماغ، ورنہ میں ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا ناول ضرور لکھتا۔ غالب ناول کے سہارے ہی مجھے یہ بتلانا مقصود تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام کیوں ہوئی۔ میدانِ جنگ کا بیان تو میں نہیں کرسکا، اس لیے کہ موقع نہیں تھا، تاہم خوں ریزی کا بیان موجود ہے اور بہادر شاہ ظفر کی مجبوری،

معذوری اور صلابت کا بھی بیان موجود ہے۔

پروفیسر عبدالعظیم ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے غالب ناول کا ایک باب پڑھنے کے لیے جلسے کا اہتمام کیا۔ سیدوالاتبار نے صدارت قبول فرمائی اور صدارتی کلمات میں فرمایا کہ لکھنؤ کے بیان کے سلسلے میں اب تک میں 'یادوں کی برات' کو حرفِ آخر سمجھتا تھا، لیکن غالب کا یہ باب سن کر مجھے اپنی رائے میں تبدیلی کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

ر۔ا: قاضی صاحب! آپ نے تخلیقی عمل سے متعلق بہت بنیادی بات کہی کہ سوانح نگاری کے دوران ہم تاریخی حقائق کو تبدیل نہیں کر سکتے، لیکن اگر ہم ناول کی تخلیق کر رہے ہیں تو بحیثیت ناول نگار ہمیں کچھ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ آپ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ اگر کچھ فکشن بھی تاریخ میں شامل کرتے ہیں تو وہ اس قدر حقیقی ہوتے ہیں کہ ہمیں پیش کیے گئے واقعے میں ہی اصل تاریخ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ تمام باتیں ناول اور تاریخی ناول کے حوالے سے گفتگو میں زیر بحث آئیں گی۔ سرِ دست آپ اپنے ناول ''تاجم سلطان'' اور ''حضرت جان'' کے متعلق کچھ فرمائیں جنھیں ہم عصر تنقید نے کچھ حد تک نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

ق۔ع: ''تاجم سلطان'' ضرورت سے زیادہ بالغ عمر کی کہانی ہے۔ میری عمر ۳۶ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، جب تاجم سلطان باقاعدہ مجھے میسر آئی۔ آٹھ سال تک ہم دونوں ملنے اور نہ ملنے کی کش مکش میں مبتلا رہے، لیکن جب وہ ملی تو محسوس ہوا جیسے ہم مدتوں سے اسی کے منتظر تھے۔ اس کی بے خود سپردگی اور بے محابہ محبت، بے پناہ قربت سب خواب ناک سا تھا۔ میں جب ذرا تنہا ہوتا تو سوچا کرتا کہ ایسا تو کسی افسانے میں بھی نہیں پڑھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے اور اسی کیفیت میں میں اس کی قربت سے شرابور رہتا۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سب خواب ہے۔ ابھی ہم کو ابوالحسن کی طرح بیدار کر دیا جائے گا اور ہم پھر علی گڑھ کی زندہ بدصورت زندگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ اس بیماری نے ایک حقیقت ہم پر واضح کر دی کہ اس کو اس کے نکاح کی بشارت مل چکی تھی۔ اس نے اپنے عاشق کا استقبال نہیں کیا تھا، اپنے دولہا کا استقبال کیا تھا۔ اپنا آپ، اپنے شوہر کو پیش کیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ساری زندگی میں یہ تماشا ہوتا رہا کہ جب ایک خوشی نصیب ہوئی تو اس کے ساتھ غم بھی لگا رہا۔ جب یہ راز فاش ہوا اس کے فوراً بعد زہر کا اثر اس پر طاری ہونے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کروں یا اپنی بدبختی کا ماتم کروں۔ وہ باون دن جو تاجم سلطان کی قربت میں بسر ہوئے، ساری عمر کے لیے ایک روگ بن گئے۔

جہاں تک ''حضرت جان'' کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتوں کا انکشاف ضروری سمجھتا ہوں۔ بہت دن ہوئے جب حیات اللہ انصاری راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے تھے اور ویسٹرن کورٹ میں قیام فرما تھے، میں ان سے ملنے گیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ بہت خوش ہوئے۔ اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ چلتے وقت فرمایا کہ اب کے جب آیئے تو ایک دن ہمارے پاس قیام کیجیے۔ میں دوسرے یا تیسرے مہینے جب دہلی گیا تو سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ویسٹرن کورٹ میں وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھے۔ میرا بستر انھیں کے کمرے میں تھا۔ جب ان کے بیٹے سدرت اپنی بیگم کے ساتھ خواب گاہ میں چلے گئے تب انصاری صاحب اُٹھے، کنجی سے ایک دراز کھولی اور ایک فائل جو ایک بڑے لفافے میں بند تھی، نکال کر مجھے دی اور کہا میں نے یہ نوٹس لیے ہیں یہاں کی ہولناک زندگی کے متعلق۔ خواہش تھی بلکہ آرزو تھی کہ میں اس پر ایک ناول لکھوں، لیکن عمر جیسے تخیل پر اور تخلیقیت پر غالب آ چکی ہے۔ ہمت نہیں پڑتی، نہ میں اتنی محنت کرنے کی قابل رہ گیا۔ اکثر یہ خیال آیا کہ آپ اس پر لکھ سکتے ہیں۔ ہر چند کہ جنس آپ کا موضوع کبھی نہیں رہا، لیکن استعاروں کی دولت تو آپ کے پاس ہے۔ اس کے وسیلے سے آپ کیسی بھی، کوئی بھی بات خوب صورتی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس کو اپنے بیگ میں رکھ لیجیے۔ اطمینان سے پڑھیے اور ضائع کر دیجیے، یہ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا۔ میں نے عرض کیا انصاری صاحب اگر آپ حکم دیں تو میں اسی شب میں اسے پڑھ لوں اور آپ کے سامنے اسے ضائع کر دوں۔ نہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اطمینان سے پڑھیں۔ میں نے بڑی محنت سے بہت وقت لے کر حضرت جان لکھا۔ اس کی اشاعت کو کافی دن ہو چکے تھے جب میں قرۃ العین حیدر کی خدمت میں حاضر ہوا اور دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں Horror پر ایک ناول لکھوں۔ قرۃ العین حیدر نے برجستہ فرمایا، وہ تو آپ لکھ چکے۔ حضرت جان سے بڑا Horror اور کیا ہوگا۔ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور یہ محسوس ہوا کہ میری محنت سوارت ہوگئی۔

ر۔ا: قاضی صاحب! اب کچھ باتیں آپ کے ناولٹ کے حوالے سے ہونی چاہئیں۔ ''مجو بھیا'' اور ''بادل'' کے عنوان سے دو ناولٹ آپ کے قلم سے وجود میں آئے۔ اس سے پہلے کہ میں ناول اور ناولٹ کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتیں آپ سے جاننے کی کوشش کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں ناولٹ سے متعلق بھی اپنے خیالات مختصر طور پر ظاہر کریں۔ ان دونوں ناولٹ میں آپ نے اپنی انفرادیت

کس طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

ق۔ع: ہاں ناول اور تاریخی ناول یا ناول اور ناولٹ سے متعلق بنیادی باتوں کی تفصیل آگے آئے گی۔ میں پہلے اپنے دونوں ناولٹ سے متعلق مختصر طور پر کچھ باتیں بیان کرنا چاہوں گا۔ ''مجو بھیا'' میں ایک نوجوان معمولی زمین دار، ایک رئیس کے گھوڑے پر عاشق ہوتا ہے اور اسے اپنے جاں نثاروں کے ذریعے چوری کرا لیتا ہے۔ اس کا رنگ بدل دیتا ہے اور اس ضمن میں جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے، اسے قتل کر دیتا ہے یا اجاڑ دیتا ہے۔ ساری کہانی صرف دو باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ گھوڑے کا حصول اور اقتدار کی سلامتی۔ ''بادل'' کو میں نے زمینداری کی علامت بنایا ہے۔ وارث علوی اور باقر مہدی دونوں نے اسے علامتی ناولٹ کہا ہے اور یہ بھی ناولٹ ہے۔ یہاں بھی ایک زمیندار، دوسرے زمین دار کے ہاتھی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے شادی بھی کرتا ہے اور دلہن کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ ظاہری کہانی کے اندر باطنی کہانی بھی چلتی رہتی ہے۔ چوں کہ زمینداری نظام کو برباد ہونا ہی ہے، اس لیے ہاتھی کے ذریعے دو گھر برباد ہوتے ہیں اور ہاتھی خود بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کی نظیریں تو دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں کم و بیش مل بھی سکتی ہیں، لیکن ''غبارِ شب'' کی کہانی اپنی طرح کی نرالی کہانی ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر زمین داروں نے ہجرت تو کی ہے اور سیکڑوں ہزاروں نے کی ہے، لیکن غبارِ شب کے جمیل میاں نے جھام پور میں اپنی ریاست اور حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر دیا اور اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔

ر۔ا: قاضی صاحب! واقعی آپ نے جو باتیں بتائی ہیں، ان کی صداقت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ 'مجو بھیا'، 'بادل' اور 'غبارِ شب' میں آپ نے زمین دارانہ ماحول کی جس طرح تصویر کشی کی ہے، اس کی نظیر اردو ناول اور ناولٹ میں مشکل سے ملے گی۔ زمین دارانہ ماحول کی جزئیات کو دوسرے فن کاروں نے بھی اُجاگر کیا ہے، لیکن آپ نے بنیادی صداقتوں کو قدرے مختلف زاویوں سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی بنا پر اس ماحول کی جو زندہ تصویریں آپ کی تحریروں میں جھلکتی ہیں، وہ دوسرے فن کاروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ چوں کہ آپ کے ناول اور ناولٹ کے حوالے سے بنیادی باتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، لہٰذا اب ناول اور ناولٹ کے فرق سے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ جب ہم ناولٹ کی اصطلاح کا ذکر کرتے ہیں تو بہت سی چیزیں ہمارے ذہن میں واضح نہیں ہو پاتی ہیں۔ ناول سے فرق قائم کرنے کے لیے ہم ناولٹ کی اصطلاح کا سہارا لیتے ہیں، لیکن فن کی حیثیت سے ان دونوں کے مابین فرق کی وضاحت مشکل ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختصار کی بات دہرائی جا سکتی ہے، لیکن موضوع کی پیش کش کا معاملہ تو کم و بیش ایک جیسا ہی ہوتا ہے، تو کیا ناول اور ناولٹ میں صرف ضخامت کا فرق ہی قائم رہتا ہے یا کچھ اور باتیں بھی دونوں کا فرق قائم کرتی ہیں۔ آپ نے چوں کہ ناول اور ناولٹ دونوں ہی لکھے ہیں اور حسنِ اتفاق سے آپ کی تنقیدی نگاہ بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے، لہٰذا یہ ضرور بتائیں کہ آپ ناول اور ناولٹ کے فرق کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟

ق۔ع: میری ناچیز رائے میں ناول اور ناولٹ میں کینوس کا فرق ہوتا ہے، تناظر کا فرق ہوتا ہے، زندگی کی وسعت اور اختصار کے ساتھ پیش کش کا دخل ہوتا ہے۔ کینوس سے میرا مطلب ہے کہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی ضروری تفصیل کا بھی ذکر ناول میں آئے گا۔ اسی موضوع پر لکھے ہوئے ناولٹ میں جزئیات نگاری محض نمائندگی کی حد تک ہوگی۔ یہاں قلم کو بے پناہ نہیں ہونا چاہیے، جب کہ ناول میں قلم کی بے محابہ نگاری ضروری ہے۔ کرداروں کی پیش کش میں بھی جہاں تک ناول کا سوال ہے، پوری وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ بیان ہوگا جب کہ ناولٹ بڑی حد تک واضح اور ممکن اور زیادہ تر اشاروں پر مبنی ہوگا۔ یہیں افسانے کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ہم نے بار بار کہا ہے اور لکھا ہے کہ افسانہ چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن ہے۔ یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی کو سمیٹ لینے کا آرٹ ہے۔ یہاں الفاظ اشاروں کا کام کرتے ہیں، رنگوں کا کام کرتے ہیں۔ محض علامتوں کا کام کرتے ہیں۔ کسی چیز کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ شاید اسی خامی کی بنا پر افسانے کو بعض لوگوں نے چھوٹا آرٹ کہا ہے جو ہر طرح غلط ہے۔ جدیدیت کا جب ہنگامہ برپا ہوا تو اس کے ایک ''مبلغ کبیر'' نے فرمایا کہ افسانہ چھوٹا آرٹ ہے اور شاعری پیغمبروں کی زبان ہے اور بڑا ادب ہے۔ میں نے دہلی میں عرض کیا تھا کہ اس شاعر کا نام بتائیے جس پر پیغمبری ناول ہوئی ہے۔ اس پیغمبر کا نام بتائیے جس نے دیوان لکھا ہو۔ راشد صاحب یہ باتیں آپ کے خلاف جا رہی ہیں۔

ر۔ا: قاضی صاحب! آپ نے زمین دارانہ ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے جہاں یادگار ناول اور افسانے لکھے وہیں تاریخی ناولوں کے ذریعے بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔ آپ نے اپنے کئی افسانوں میں بھی تاریخی شعور کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تاریخی ناول میں بھی دو شقیں آپ کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تاریخی ناول تو

اسلامی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے جب کہ دوسرا تاریخی ناول ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے نشیب وفراز سے متعلق ہے۔ دونوں نوعیت کی تاریخی صداقتیں، تخلیقی سطح پر قدرے مختلف پیش کش کا تقاضا کرتی ہیں۔ آپ نے دونوں طرح کے تاریخی ناولوں میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔فن کی حیثیت سے آپ یہ بتانے کی زحمت کریں کہ تاریخی ناول میں کون سی بنیادی باتیں ناگزیر حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ دوسرے فن کاروں نے بھی تاریخی ناولوں کو اپنی تخلیقی ترجیحات میں شامل رکھا ہے اور مختلف نوعیت کے تاریخی ناول لکھے ہیں۔آپ نے تخلیقی سطح پر دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں کون سا مختلف راستہ اختیار کیا ہے؟

ق۔ع: میں پہلے ناول اور تاریخی ناول کے فرق پر بات کروں گا۔ ناول اور تاریخی ناول کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ناول میں کرداروں کی تخلیق اور ان کی پیش کش میں تخیل بے محابہ ہوسکتا ہے، لیکن تاریخی ناول میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ناول میں جو کردار ہوتے ہیں وہ عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور انھیں کو ناول میں پیش کیا جاتا ہے جو قدرے آسان اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے لاحقے اور سابقے سب آپ کی نظر میں ہوتے ہیں۔تاریخی ناول کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کوئی چیز نظر کے سامنے نہیں ہے۔سب کچھ الفاظ کے پردوں میں گم ہوتا ہے اور آپ کو وہ پردے ہٹا کر کردار کی زندگی میں جھانکنا پڑتا ہے۔اس کی اردگرد کی زندگی کو پیش کرنا ہوتا ہے۔

فضا آفرینی تاریخی ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔اگر کوئی ناول نگار فضا کی تخلیق پر قادر نہیں ہے تو وہ ناکام تاریخی ناول نگار ہے۔فضا کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات اور معمولی سے معمولی جزئیات کا علم بھی ہو اور اس کے انتخاب کا سلیقہ بھی ہو۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے، یہ صرف بڑا ادیب جانتا ہے کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔ جب مغل اعظم فلم آئی تو بہت مقبول ہوئی۔ ظاہر ہے کہ تاریخی طور پر وہ واقعہ صحیح نہیں ہے، لیکن جس طرح پیش کش ہوئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔اختر الایمان کو بھی اس کے لکھنے میں شمولیت کا موقع ملا تھا اور ان کو کوئی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ میں جب بمبئی گیا تو دارا شکوہ کی شہرت موجود تھی۔اختر الایمان نے مجھے کھانے پر بلایا اور دورانِ گفتگو 'مغل اعظم' پر باتیں کیں۔ میں نے تعریف کی۔اختر الایمان نے پوچھا کہ خامی بتایئے تو میں نے عرض کیا کہ بیسیوں ہیں۔مثلاً میدانِ جنگ میں اکبر کہتا ہے کہ ''یلغار ہو۔'' یہ ''ہو'' کیا چیز ہے؟ لکھنے والے کو نہیں معلوم کہ مغل شہنشاہ بہت کم بولتے تھے۔ جب بولتے تھے تو زمین وآسمان خاموش ہوجاتے تھے۔ یلغار کا لفظ کافی ہے۔توپ کے حملے کے لیے ضرب کا لفظ کافی ہے۔ نعرے لگانے کی ضرورت نہیں۔

ر۔ا: قاضی صاحب! آپ نے تفصیل کے ساتھ ناول اور تاریخی ناول کے فرق کی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ تاریخی ناول نگار لکھنے کے دوران کن باتوں کو اپنے پیش نگاہ رکھے تاکہ وہ موضوع سے انصاف کرسکے۔ ناول نگار اگر زبان و بیان پر گرفت رکھتا ہے اور نفسیاتی پہلوؤں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے تو فن کے بہترین نمونے وجود میں آتے ہیں، لیکن اس مرحلے پر بھی اسے بعض ناگزیر پہلوؤں پر بہ طور خاص توجہ مرکوز کرنی چاہیے تاکہ قصے کے بیان میں منطقی توجیہ بھی شامل ہوسکے۔آپ نے بہت بنیادی باتوں کی جانب اشارے کیے۔ ناول نگار اگر تاریخی ناول لکھنے کے دوران ان باتوں کو نظرانداز کرے گا تو وہ خود اپنے لیے تضحیک کا سامان فراہم کرے گا۔ میں آپ کی توجہ ایک اور بنیادی پہلو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کے مابین فرق کی نشان دہی کریں۔زمین دارانہ ناول اور جاگیردارانہ ناول کی بات بھی عام طور پر کی جاتی ہے۔کیا یہ دونوں ناول ایک جیسے ہوتے ہیں یا ان میں بھی کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ زمیندار اور جاگیردار میں تو بہرحال فرق ہوتا ہے اور آپ نے اس کی وضاحت بھی کی ہے، لیکن دونوں ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے ناولوں میں اس ماحول کے فرق کو کس طرح برقرار رکھا جاتا ہے۔

ق۔ع: بھئی سب سے پہلے تو ناول نگار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ زمین دار صرف اپنے لیے زندہ رہتا ہے، اس کا نہ باپ ہوتا ہے، نہ بیٹا، نہ بیوی، نہ بچے۔ میری ناچیز رائے میں زمین دار محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر کی معنوی اولاد ہوتا ہے جسے صرف اپنی حکومت، اپنی عشرت، اپنی انا ہی عزیز ہوتی ہے۔اب اس کے بیان میں سات چیزیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، کسی نہ کسی صورت میں نظر آنا ضروری ہے۔زمین دار اگر مسلمان ہے تو اس کا مختار ہندو ہوگا۔ یہ قانون تھا، اور زمین دار اگر ہندو ہے تو اس کا مختار مسلمان ہوگا۔جیسے یہ ان کا لکھا قانون ہے جس پر تعلق داری نظام کا انحصار تھا۔ترقی پسند تحریک نے تعلق دار کو ایک طبقے کی طرح بیان کیا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے، لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ ہر زمیندار اور تعلقہ دار پہلے ایک فرد ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی طبقاتی مجبوریاں ہوتی ہیں جس کی پیش کش ترقی پسند تحریک کے کسی لکھنے والے نے نہیں کی۔اس بیان کی جسارت صرف خاکسار نے کی۔ ہرچند کہ شروع میں میری شدید مخالفت ہوئی، لیکن بالآخر میری شہرت اور مقبولیت نے اسے دفن کردیا۔

◆◆◆